# سنہ ۱۹۴۱ء

# کی

# بہترین نظمیں

پیشکش

## حلقہ ارباب ذوق

لاہور

# سنہ ۱۹۴۱ء

# کی

# بہترین نظمیں

مرتبہ

حلقۂ اربابِ ذوق

لاہور

# فہرس


| نمبر شمار | | | | صفحات |
|---|---|---|---|---|
| ۱ | پیش لفظ | | | ۵ |
| ۲ | ابتدائیہ | | | ۹ |


## نظمیں


| | عنوان | شاعر | ماہِ اشاعت | |
|---|---|---|---|---|
| ۳ | ازلی مسرتوں کی ازلی منزل | احمد ندیم قاسمی | جنوری | ۲۳ |
| ۴ | انتباہ | فیض احمد | جنوری | ۲۵ |
| ۵ | رات کی بات | مختار صدیقی | جنوری | ۲۶ |
| ۶ | نفسیات | عظیم قریشی | جنوری | ۲۸ |
| ۷ | خودکشی | ن۔م راشد | فروری | ۲۹ |
| ۸ | تو اگر واپس نہ آتی | جوش ملیح آبادی | مارچ | ۳۱ |
| ۹ | جوابِ تغافل | عبدالحمید عدم | مارچ | ۳۳ |
| ۱۰ | بنی آدم | قیوم نظر | اپریل | ۳۵ |
| ۱۱ | چاندنی | تخت سنگھ | اپریل | ۳۶ |
| ۱۲ | برات | مقبول حسین احمد پوری | اپریل | ۳۷ |

| نمبرشمار | عنوان | شاعر | ماہ اشاعت | صفحات |
|---|---|---|---|---|
| ۱۳ | پسپائی | شریف کنجاہی | مئی | ۳۹ |
| ۱۴ | ننھا قاصد | اختر شیرانی | جون۔ جولائی | ۴۱ |
| ۱۵ | ڈرائنگ روم | سلام مچھلی شہری | جولائی | ۴۳ |
| ۱۶ | تیرے ہی نچے تیرے ہی بالے | مطلبی فرید آبادی | جولائی | ۴۴ |
| ۱۷ | انوکھا بیوپاری | مخمور جالندھری | اگست | ۴۶ |
| ۱۸ | دسہرا اشنان | شاد عارفی | اگست | ۴۸ |
| ۱۹ | دھوبی کا گھاٹ | میراجی | ستمبر | ۵۱ |
| ۲۰ | نقش پا | اختر الایمان | ستمبر | ۵۳ |
| ۲۱ | جنت کی سیر | مہدی علی خاں | ستمبر | ۵۵ |
| ۲۲ | حسینہ کی موت | سعید احمد اعجاز | اکتوبر | ۵۶ |
| ۲۳ | رقص | یوسف ظفر | اکتوبر | ۵۷ |
| ۲۴ | خاکے | وشوامتر عادل | نومبر | ۵۹ |



---


ناشران

حلقۂ ارباب ذوق لاہور

(اس مجموعے کی تمام آمدنی حلقۂ ارباب ذوق کو جائے گی)

قیمت آٹھ آنے (۸؍)

گئے سال سالانہ اجلاس کے موقع پر حلقے نے اردو شعر کے متعلق ایک خاص پروگرام پیش کیا تھا یعنی ایک خاص قسم کے مشاعرے میں ہیئت اور موضوع کے لحاظ سے تجربہ کرنے والے شعرا کی منتخب نظموں کو پڑھا گیا تھا۔ خیال تھا کہ آئندہ موقعوں پر ہر سال ادب کی مختلف اصناف میں سے ایک کے متعلق اسی قسم کا کوئی پروگرام پیش کیا جاتا رہے گا۔ لیکن اس سال وہ ارادہ نثر کے لحاظ سے اور ہی صورت میں وقوع پذیر ہوا۔ جب حلقے کے ارکان سے سالانہ اجلاس کے پروگرام کے متعلق تجاویز طلب کی گئیں تو ایک خوش فہم رکن نے یہ تجویز کیا کہ نثر کے ساتھ نظم کے سلسلے میں بھی ۱۹۴۱ء کی بہترین نظمیں پیش کی جائیں۔ چونکہ شعر ہی ادب کی بلند ترین اور پائیدار صورت ہے۔ اس لئے انتظامی کمیٹی نے اس تجویز کی عملی تائید کی اور تین ارکان پر مشتمل ایک ذیلی کمیٹی نظموں کے انتخاب، ترتیب اور متعلقہ مضمون کے لئے وجود میں لائی گئی۔ اس ذیلی کمیٹی نے جس ڈھب سے تمام کام کو تکمیل تک پہنچایا۔ وہ اب آپ کے سامنے ہے۔ اور ان کے طریقِ انتخاب کی وضاحت متعلقہ مضمون میں درج ہے۔ مذکورہ کمیٹی نے انتظامی کمیٹی کے حسبِ ہدایات اس انتخاب کو حلقے کے نقطۂ نظر سے ترتیب دیا ہے۔ لیکن اس بات کا امکان ہو سکتا ہے کہ کسی رکن کو اس مجموعے کے کسی پہلو سے اختلاف ہو۔ اس صورت میں یہ واضح کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بنیادی طور پر اس انتخاب کی تمام تر ذمہ داری انتظامی کمیٹی پر ہے۔

# شکریہ

حلقہ ارباب ذوق کی انتظامی کمیٹی ذیل کے حضرات کی ممنون ہے:-

| | |
|---|---|
| ۱۔ آفتاب احمد (رکن حلقہ) | مجموعے سے متعلق تجویز کے لئے |
| ۲۔ مدیر ماہنامہ ساقی دہلی | نظموں کے لئے |
| ۳۔ مدیر ماہنامہ نگار لکھنؤ | " |
| ۴۔ مدیر ماہنامہ جامعہ دہلی | " |
| ۵۔ مدیر ماہنامہ ادب لطیف لاہور | " |
| ۶۔ مدیر ماہنامہ ہمایوں لاہور | " |
| ۷۔ مدیر ماہنامہ ادبی دنیا لاہور | " |
| ۸۔ مدیر ماہنامہ شاہکار لاہور | " |
| ۹۔ مدیر ماہنامہ داستان لاہور | " |
| ۱۰۔ مدیر ماہنامہ پریت لڑی امرت سر | " |
| ۱۱۔ مدیر اخبار ہندوستان لکھنؤ | " |

پروگرام کی اس شق کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا فیصلہ سالانہ اجلاس سے چند روز پہلے ہوا۔ اس لئے حضرات مذکورہ بالا سے نظموں کی اشاعت کے لئے رسمی اجازت طلب نہ کی جا سکی، زبانی جن سے کہا جا سکا کہہ لیا گیا، اور چونکہ اس کتاب کی آمدنی کسی فرد کی بجائے ایک انجمن کو جا رہی ہے۔ اس لئے توقع ہے کہ متعلقہ حضرات رسمی باتوں پر خوش فہمی کو ترجیح دیں گے۔

سکرٹری

# ابتدائیہ

# اندازِ نظر

خوب ہے، جو حسیں ہُوا،
بُت ہُوا، نازنیں ہُوا
جو نہ حسیں ہُوا، مگر
خوب ہُوا، حسیں ہُوا

(ترجمہ از منصور احمد)

(سیفو)

انسان کے تجسّس نے اُسے پیڑوں سے زمین پر لا کھڑا کیا۔ پہلے کچھ دیر تک وہ پیدل چلتا رہا۔ تھک گیا، اِدھر اُدھر دیکھا۔ گدھا گھوڑا اونٹ چلتے پھرتے دکھائی دیئے۔ اُن میں سے ایک کو پکڑا۔ اور اُس پر بیٹھ کر بڑھنے لگا۔ لیکن سفر کے طریقوں میں ابھی بہت بڑی گنجائش تھی۔ اور تنہا سفر بھی کوئی سفر ہے۔ اپنی عورت، اپنے بچّے بھی اگر ساتھ ہوں۔ اسی خیال نے ایک ایسی چیز کی ایجاد کی تحریک دی جواب تک سب ایجادوں پر بھاری ہے۔ چکر بنا۔ اور پھر گاڑی اور پھر ریل اور پھر اڑن کھٹولوں کے خواب ہوائی جہازوں کی تعبیر لئے ظاہر ہوئے۔ پیڑوں پر پھدکتے والا زمین پر رینگنے والا ہواؤں میں اڑنے لگا۔ انسانی زندگی سے یہ ساری بدلتی ہوئی باتیں صرف عملی پہلو ہی سے ہم آہنگ نہ ہوئیں بلکہ انسان کے خیالات پر بھی ان کا اثر ہوا اور ادب کی زندگی میں بھی انسان کی زندگی ہی سے ملتے جلتے تغیرات رونما ہوئے۔ پہلے پیٹ بھر چکنے کے بعد ساتھ۔ بننے والی ایک دلکش چیز دکھائی دی۔ ساتھ والی سے جی بھر چکا تو آسودگی اور فراغت کا سانس لیتے ہوئے کھلے آسمان اور اُس کے چاند ستاروں پر نگاہیں پڑیں۔ اِن کی ماہیت سے لاعلمی نے ذہن میں خالق کا تصور پیدا کیا۔ ساتھ ہی ساتھ بڑھتے ہوئے بال بچوں نے دائیں بائیں آگے پیچھے ہاتھ پھیلانا شروع کئے۔ جنگ کی ابتدا ہوئی۔ اب تک محبت اور مذہب ہی ادب کا سرمایہ رہے تھے۔ اب جنگ بھی ان میں شامل ہو گئی۔ اور پھر بڑھتی ہوئی پھیلتی زندگی کی الجھنیں ایک تانے بانے کی صورت میں نظر آنے لگیں اور ادب بھی ایک گورکھ دھندا بن کر رہ گیا۔

صدیاں گزر گئیں۔ آس پاس لیٹی ہوئی زمین اور اوپر پھیلے ہوئے آسمان سے ترقی کرتا ہوا ذہن
اُکتا گیا۔ اپنے اندر دیکھنے لگا۔ اپنے ہمسایوں کی خلوت میں بھی جھانکنے لگا۔ اور ادب
کی تیز رفتاری ریل گاڑی سے ہٹ کر ہوائی جہاز کی ہمنوائی کرنے لگی۔ یہ آج کی بات
ہے۔ لیکن آج والوں کو کل کی بات کچھ یوں معلوم ہوتی ہے۔ جیسے پرانے ادب نے
ہیرے جواہرات سے ایک محل بنا رکھا تھا اور اس کے دروازے سونے کے تھے۔
اور زندگی اس محل میں نہیں جا سکتی تھی۔ کیونکہ زندگی راجہ نہیں بلکہ پرجا ہے۔ پرجا
اس لئے کہ زندگی ہر کسی کے بس کی بات ہے۔ ہر کوئی سانس لے سکتا ہے۔ لیکن
سونے کے دروازوں سے ہر کوئی آ جا نہیں سکتا چنانچہ وہ جڑاؤ محل الگ تھلگ
کھڑا رہا۔ اور زندگی اُس سے دور الگ تھلگ بیٹھی رہی۔ اس دوران میں وقت کروٹیں لیتا
رہا۔ کسی کروٹ کا نتیجہ انفرادیت کی بیداری ہوا جس نے نت نئے رنگ پکڑے۔ کسی
کروٹ کا نتیجہ جمہوریت کی تخلیق بنا۔ اور جمہوریت نے رفتہ رفتہ اپنی ایک الگ عمارت کھڑی
کر لی۔ یہ عمارت محل نہ تھی۔ ایک نئے انداز کا معبد تھی جس کی پوجا تو بہت پرانی لیکن اس
پوجا کے طریقے نئے تھے۔ عبادت کا پرانا طریقہ عاجزی تھا۔ یوں جیسے آسمان پر دور کہیں
کوئی دھندلا ستارہ دکھائی دے رہا ہو۔ لیکن عبادت کے اس نئے طریقے میں ایک
تیزی تھی ایک تندی، ٹوٹتے ستارے کی ایسی۔ پہلا پرانا ستارہ خواہ کتنا ہی دور
کیوں نہ رہے اُس کے حسن میں ایک قرار ہے۔ ایک دوام۔ لیکن اس دوسرے ستارے
کی دلکشی ہنگامی ہے۔ ایک دو لمحوں کی بات۔ آپ جانتے ہیں کہ بسا اوقات ایک ہی
دو لمحوں کی باتیں بڑے بڑے متنازعہ فیہ مسائل پیش نظر کر دیتی ہیں۔ اس ٹوٹتے ستارے
کی مختصر سی بات نے بھی ادب کی تاریخ میں غالباً پہلی بار ایک متنازعہ فیہ مسئلہ ہمارے
پیش نظر کر دیا ہے۔ آج والے کہتے ہیں کہ کل والے ادب کے ذریعے سے حسن کی
تلاش میں فن برائے فن کے قائل تھے۔ اور اس لئے اُن کے کلام کو زندگی سے کوئی
تعلق نہ تھا۔ اور اس لئے اُن کا کلام زندگی کے لئے مفید نہ تھا۔ افیون تھی جو زندگی
کی اُبلتی ہوئی کیفیت کے لئے سم قاتل تھی۔ اگر آج والے صرف یہیں تک رہتے تو اُن

کی بات کو ایک بات سمجھ کر سنا جا سکتا تھا۔ اور سُن کر خاموش رہا جا سکتا تھا۔ یا دل سے بھلا دیا جا سکتا تھا۔ لیکن وہ کل والوں پر رائے زنی کے بعد ان کے کلام کا نعم البدل اپنے کلام سے پیش کرتے ہیں۔ اور اس نومولود کا نام فن برائے حیات رکھتے ہیں۔
ہمیں یہ نومولود ایک طرح سے عجیب الطرفین دکھائی نہیں دیتا۔ کیونکہ ہماری نظر میں اس کی نوعیت متنازعہ فیہ بن جاتی ہے۔ کیونکہ اگر ایک دو لمحوں کے لئے فن برائے حیات کو تسلیم بھی کر لیا جائے۔ تو ہم کہیں گے۔ کہ فن برائے فن کے بغیر فن ہی نہیں ہو سکتا پھر یہ برائے حیات، کا دم چھلا کیسا۔ حقیقت میں تہذیب و تمدن نے جن، حشو و زوائد کو ہم پر طاری کر دیا ہے۔ ان ہی میں سے یہ برائے حیات کا تصوّر بھی ایک چیز ہے۔ پہلے زندگی اور ڈھب پر چل رہی تھی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اُس زمانے کے لوگوں کی باتیں زندگی کی ترجمان نہ تھیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ لوگ حال کے بعض سیاسی نظریے اور سماجی اور اقتصادی نظام کے موجودہ رنگوں سے واقف نہ تھے۔ جوانی سے بھرپور انسان بڑھاپے کی باتیں کیونکر کہہ سکتا ہے۔ اگر کہے گا تو ایک غیر فطری استثنیٰ کا درجہ پائے گا۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ادب کے پہلے اور نئے نظریوں میں جو تبدیلی رونما ہوئی وہ انسان کی جسمانی صحت سے تعلق رکھتی ہے۔ پہلے انسان کی صحت اُسے صحت مندانہ باتوں کی طرف راغب کرتی تھی۔ لیکن امراض کا اندیشہ اُسے مرض کی کیفیت کو فراموش نہیں کرنے دیتا تھا۔ آج کے انسان کی صحت جسمانی لحاظ سے ناساز ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ایک مریض مرض کی باتیں زیادہ کیا کرتا ہے۔ بلکہ صحت مند لوگوں سے اُسے ایک پنہاں قسم کی پرخاش، نفرت، حسد پیدا ہو جاتا ہے۔ آج کے بعض انسانوں کی کیفیت کچھ ایسی ہی ہے اور شاید وہ بعض انفرادی اور وقتی اغراض سے متاثر ہو کر اس حقیقت سے گریز کر رہے ہیں کہ اصلاً ادب میں کوئی تغیر رونما نہیں ہوا۔ بلکہ پروفیسر کلیم الدین کے الفاظ میں روایات اب بھی وہی ہیں صرف الفاظ بدل گئے ہیں۔ گویا جہاں تک تنقید ادب کا سوال ہے۔ انداز نظر کا مذکورہ بحث تغیر محض لغوی ہے نظری نہیں۔ کیونکہ فن زندگی چھوڑ جس سے جی چاہے لپٹ جائے

بہر صورت فن ہی رہے گا۔ یہ اور بات ہے کہ ترقی پسندانہ ادب کے تصور کی بنیاد وہم ہیں سے بعض انسان آج کل کے مائل بہ مادیت زمانے میں بنیوں کی طرح مفید اور غیر مفید پر رکھ بیٹھے ہیں۔ لیکن چراغ کی لو نہیں، برقی قمقمہ بھی نہیں، سورج کی زوردار اور بنیادی روشنی ہمیں یہی سمجھاتی ہے کہ صحیح اور صحت مندانہ ترقی پسندی مختصر لفظوں میں خیال افروزی کا دوسرا نام ہے جو ادب خیال افروز ہو گا وہ زندگی کے ہر شعبے میں ہمیشہ ہمیں ایک قدم آگے بڑھانے پر مجبور کر دے گا۔ لیکن اگر ہم زندگی کی وسعت کو بھول کر وقت کے خط میں سے ایک نقطے کو لے کر، جزو کو کل سمجھ بیٹھیں گے تو کوئیں کے مینڈک بن کر رہ جائیں گے۔ اس کے برعکس اگر ترقی پسندی کے صحیح مفہوم کو مشعل بناتے ہوئے ہم خیال افروزی کو مدِ نظر رکھیں گے، خواہ وہ زندگی کے کسی بھی شعبے سے تعلق رکھتی ہو، تو ذہنی اور جسمانی دوڑ میں ہماری پس ماندگی کا کوئی سوال ہی نہ پیدا ہو سکے گا۔

چنانچہ نثر اور نظم دونوں اصنافِ سخن کے متعلق اب تک حلقۂ اربابِ ذوق کا نقطۂ نظر یہی رہا ہے۔ اور اس نقطۂ نظر کی وسعت بہ آسانی زندگی سے وہ ہم آہنگی حاصل کر سکی ہے جس کا ایک اظہار آج کی نظموں کا انتخاب بھی ہے۔

لیکن اس انتخاب کی نظموں سے زندگی کی مطابقت ثابت کرنے سے پہلے ایک دو اور باتوں کو سرسری طور پر دیکھ لیا جائے۔ اردو شاعری کے جدید رجحانات اور ہیئت اور موضوع کے لحاظ سے نت نئے رنگوں کے متعلق یہاں کچھ کہنا شاید بات کو طول دینا ہو کیونکہ اس سلسلے میں بہت سے لوگوں نے اپنا اپنا تصور قائم کر رکھا ہے۔ اور غور و فکر کا شعور بیدار ہے۔ لیکن جہاں موضوع سے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب نہ صرف گل و بلبل، نہ باغ و بہار یعنی نیچرل شاعری، نہ جمہور کی پکار یعنی قومی شاعری اور نہ نفس کا اظہار یعنی جنسی شاعری ہی اردو شاعری کا موضوع ہے بلکہ یہ سب باتیں الگ الگ اور ایک دوسرے میں گھل مل کر ہمارے موجودہ لکھنے والوں کو تحریکِ شعری دے رہی ہیں۔ وہاں

ہیئت کے لحاظ سے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اب صرف پابند اور آزاد نظم ہی کی دو صورتیں نہیں ہیں۔ بلکہ پابند میں کئی رنگ اور آزاد میں بھی نظم معرّیٰ کے پہلو بہ پہلو مختلف صورتیں نمودار ہو رہی ہیں۔ گویا موضوع اور ہیئت کے لحاظ سے بے شمار معبد بنتے جا رہے ہیں۔ اور اگر یہی تخلیق اور تعمیر کی بھی رفتار جاری رہی تو اُن معابد کے بتوں کی تعداد ایک دن دیوتاؤں کی تعداد کو شرمانے لگے گی۔

اظہار، ترجمانی اور تنقید ادب کے لحاظ سے بھی اب وہ پہلے کی سی بات نہیں ہے۔ پہلے غزل تھی۔ اور مشاعرے تھے۔ لیکن غزل کا زوال مشاعروں کو مٹا نہ سکا۔ اپنے ابتدائی ایام میں نظم ہنگامہ بپا کرتی رہی۔ رفتہ رفتہ طباعت کی نشرواشاعت میں وسعت پیدا ہوئی اور اس نئے ذریعۂ اظہار کی فراوانی نے جہاں مشاعروں کی ضرورت کو کم کر دیا۔ وہاں کم سے کم نظموں میں ایسے کلام کی کثرت بھی پیدا کر دی۔ جس کے لئے طباعت ہی بہتر ذریعۂ اظہار ہو سکتی تھی۔ اور یوں نظم اپنے ابتدائی دور سے گذر کر روزبروز پڑھنے کی ایک چیز بنتی گئی۔ انفرادی زندگی پہلے ایک محدود دائرے میں عمل پیرا تھی لیکن مغربی اثرات کے ساتھ ساتھ یہ دائرہ پھیلتا گیا۔ اور مرکزی تغیرات کے علاوہ قریبی اور دور کے گردوپیش نے انسانی ذہن کو پریشان کر دیا۔ پہلے قومی یا ملکی لحاظ سے انحطاط کے باوجود افراد اپنے آپ کو ایک طرح سے مطمئن اور قائم پاتے تھے کیونکہ وہ خود کو اکائی کی بجائے جماعت کی صورت میں دیکھتے تھے۔ اب پھیلتی ہوئی اور بکھرتی ہوئی زندگی کی اضطراری حالتوں نے ان ادراک کو کچھ اس طرح ڈگمگا دیا کہ وہ اپنے آپ کو جماعت کی بجائے ایک فرد محسوس کرنے لگے۔ بہتے ہوئے دھارے کی لہروں پر ایک تنکا اور اس شعور نے اُن کی ذہانت اور ذہنیت دونوں پر اثر کیا۔ ذہانت نت نئے تأثر لیتی گئی اور ذہنیت ہر چیز کی ہنگامی حیثیت کے باعث تشنگی محسوس کرنے لگی۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں احتیاط اور تنقید کے معین اندازِ نظر کی بجائے بے راہی اور انتشارِ نظر پیدا ہو گیا۔ زندگی کو وہ ایک اور ہی عینک سے دیکھنے لگے۔ اس عینک کے شیشوں سے آرپار نہیں دیکھا جا

سکتا تھا۔ بلکہ اُن میں اپنی ہی ذات کا ایک ایسا عکس پڑتا تھا جس کی بنا پر ہم جزو سے کُل کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ خصوصاً اس حالت میں جب کہ ہمیں ایسی بے شمار عینکیں ہاتھ آجاتی ہیں۔ سیاسی اقتصادی اور جنسی بے اطمینانی کے اثرات سے ہمیں اپنے علاوہ ہر کوئی اجنبی اور دشمن نظر آ سکتا ہے۔ لیکن اس بات کو نہیں بھولنا چاہئے کہ وہ اجنبی عینکیں دشمن نہیں ہیں۔ بلکہ ہماری ہی ذات کا ایک عکس ہیں۔ کیونکہ ہم بھی اُسی کُل کا ایک جزو ہیں۔ جس کا ایک جزو وہ عینک ہے۔ شاید حسد ہمیں مجبور کرے کہ ہماری بجائے اور شخص نے اس منظر کو کیوں دیکھا۔ اس بات کو کیوں جانا شاید خود بینی یا خود پرستی ہمیں مجبور کرے اور ہمیں یہ بُرا معلوم ہو کہ ہمارے علاوہ کوئی اور ہماری کسی پوشیدہ بات کو جان لے لیکن ہمیں چاہئے کہ اُس تصوّر کو اُس خیال کو اُس کے متعلقہ فرد سے ہٹ کر جانچیں۔ کیونکہ یہی ایک طریقہ ہے جس سے ہم فائدہ اٹھا سکتے ہیں (اگر فائدہ اٹھانا ہی ضروری ہے!)

ہماری شاعری گذشتہ پندرہ سال سے لے کر اب تک ایک ہنگامی دور سے گزر رہی ہے۔ اور اگرچہ پرانے خیالوں اور پرانے اصولوں کا اثر پہلے سے بہت ہی کم ہو گیا ہے بلکہ جا رہا ہے پھر بھی آج ایک طبقہ ایسا ہے جو بڑھتے ہوئے خیالات کی حیات پرور خصوصیت کو نظر انداز کرتے ہوئے شعر اور دوسری اصنافِ سخن میں بھی سب سے پہلے زبان اور محاورے کا قائل ہے۔ دوسرا طبقہ ان الفاظ کے قیدیوں کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے خیال ہی کو پہلی اور آخری چیز سمجھتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اپنے علم کے مطابق زبان اور محاورے کی پابندی بھی کئے جا رہا ہے تیسرے طبقے کو بنیادی طور پر نہ خیال سے تعلق ہے، نہ زبان اور محاورے سے۔ یہ شعر میں بھی پروپیگنڈے کے عنصر کو مقدم سمجھتا ہے۔ لیکن ہمیں ان تینوں پر غور کر کے فیصلہ کرنا ہو گا کہ کون سی روش بہترین قرار دی جا سکتی ہے۔ یہاں اشارۃً صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ دھارے کی رو میں نہ بہنے والے محتاط فن کار ہی اپنی تخلیقات کو آغاز سے اب تک موثر اور پائدار بنا سکے ہیں۔ یہ مانا کہ آج شعر کی قدر و قیمت کا انحصار نقّاد کی بجائے پڑھنے والے پر ہوتا جا رہا ہے۔ اور نقّاد کی حیثیت مغربی

اندازِ تنقید کے اثرات سے صرف ایک شارح کی ایسی بنتی جا رہی ہے۔ اور جس طرح نبگی کو دریا میں ڈال اصیح نہیں رہا یعنی اس اخلاقی خوبی کی اب نفسہٖ کوئی حیثیت نہیں۔ اس طرح حسن بھی ایک اِضافی چیز ہو گیا ہے۔ اور وہ پرانا اندازِ نظر کہ شعر لکھ اور دیوان میں رکھ اب کارآمد ثابت نہیں ہو سکتا۔ اس صورتِ حال میں ظاہر ہے کہ بڑھتی ہوئی مانگ اور بڑھتی ہوئی کھپت کے لحاظ سے پہلے کی طرح معین اصول ہماری رہنمائی نہیں کر سکتے بلکہ ہمیں ایسے اصولوں کی ضرورت ہے۔ جو نت نئے رنگوں میں ڈھلتے چلے جائیں جن میں ایک لچک ہو جو نئی باتوں کو قابو میں رکھنے کے ساتھ ہی ساتھ کافی حد تک اپنے کو بھی اُن باتوں کے مطابق بنا لیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ صرف نئی باتیں ہی ہمارے ذہنوں پر چھا جائیں۔ ہمارا ماضی کا سرمایہ بھی ہمارے ساتھ ہی رہے گا۔ ہم سے الگ نہیں ہو سکتا۔ جیسے سائنس خواہ انسان کو ایک مشین ہی کیوں نہ بنا دے۔ جب تک وہ انسان ہے اس میں سے بعض بنیادی باتیں خارج نہیں ہو سکتیں۔ ویسے ہی شعر پر وقتی حالات خواہ کیسے ہی اثرات کیوں نہ کریں ہم اُس کے موضوعات میں سے شگفتی ماہمت، عقیدت، رحم، رعنائی، محبت، مامتا، برادرانہ تعلق، پدرانہ شفقت اور ایسی ہی اور بہت سی باتوں کو نہیں نکال سکتے۔ کیونکہ کشمکشِ حیات میں اِن باتوں نے آج تک گریز کے طور پر انسان کا ساتھ دیا ہے۔ اور یہ ساتھ کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ کیونکہ جب جیون ناٹک ختم ہو جائے اور اس کے اداکار اُس کے کھیلنے والے اپنے اپنے بہروپ اُتار ڈالیں تو اُس کے بعد بھی جیون نہیں مٹ سکتا۔ زندگی قائم ہی رہے گی اور بہتی جائے گی۔

یہاں پہنچ کر اتنی اِدھر اُدھر کی لیکن متعلقہ باتوں کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مجموعے کے طریقِ انتخاب کے بارے میں کچھ وضاحت کر دی جائے۔ جیسے کہ پیش لفظ میں بیان کیا جا چکا ہے انتظامی کمیٹی نے تین ارکان پر مشتمل ایک ذیلی کمیٹی بنائی تھی۔ اس کمیٹی کے ہر رکن نے اپنے طور پر ۱۹۴۱ء کے مختلف اخبارات اور رسائل کا مطالعہ کیا۔ ڈیڑھ ماہ کے عرصے میں یہ ابتدائی کام تکمیل کو پہنچا بیسیوں بلکہ سینکڑوں قلندر بابا اکارا اور رجسٹرا قسم کے رسائل اور اخبارات کو چھوڑ کر مجوزہ فہرست پچاس

اور ساٹھ کے درمیان پہنچتی تھی۔ ہرکن نے اس مواد میں سے الگ الگ قریباً دو دو سو نظموں کا انتخاب کیا۔ اس انتخاب میں بہت سی نظمیں مشترک تھیں۔ ان تین فہرستوں سے معمولی بحث کے بعد پچاس نظموں کا ایک مشترک انتخاب کیا گیا۔ اور اس ثانوی انتخاب سے تیسرا انتخاب پچیس نظموں کا ہوا جس میں سے شدید غور وفکر اور بحث کے بعد ایک دو نظمیں اور گرا دی گئیں۔ ایک اور بات کا لحاظ بھی رکھا گیا تھا اور وہ یہ کہ اگر کسی شاعر کی ایک سے زائد نظمیں اس آخری انتخاب میں آجائیں تو اُن میں سے بہترین کو ترجیح دی جائے۔ جو طریقِ انتخاب اوپر بتایا گیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس کے لحاظ سے کسی قسم کی حق تلفی، جانبداری یا کوتاہی کا امکان نہیں رہتا۔ آخری انتخاب کے لئے بہترین نظم کے تصور سے متعلق جو اصول مدِ نظر رکھے گئے اُن میں بھی مندرجہ بالا اشتراکی عمل ہی بروئے کار لایا گیا۔ یعنی ہرکن نے اپنی اپنی طرف سے بہترین نظم کا تصور پیش کیا۔ اور ان تین پہلوؤں سے مشترک اجزا کو نکال کر بحث کے بعد ایک خاکہ قائم کر لیا گیا۔ ذہنی پس منظر میں شعر کی وضاحت یوں رکھی گئی — کوئی خیال یا احساس یا جذبہ جس کی ترجمانی کم سے کم اور مناسب ترین اور بہترین لفظوں میں کی جائے۔ اس کے بعد شعر یا نظم کے دو بڑے پہلو مقرر ہوئے۔ پہلا خیال یا موضوع کا، اور دوسرا فنی۔ خیال یا موضوع کے اعتبار سے اُس کی افادیت کا لحاظ بھی رکھا گیا خواہ وہ افادیت انسانی زندگی کے کسی بھی پہلو یا شعبے سے تعلق رکھتی ہو یعنی نظری ہو یا عملی۔ دوسری بات اُس خیال یا موضوع کی ادب میں تخئیلی (یا فنی لحاظ) سے بنفسہٖ اور ممکن ہو تو اضافی طور پر اہمیت اور درجہ۔ اس کے ساتھ ہی کسی ادبی تحریک کی روشنی میں بنفسہٖ یا اضافی طور پر اُس کی اہمیت اور کسی حد تک عصری شعر پر اس کا تاثر (یہ آخری نکتہ ذیلی ہے) دوسرا بڑا پہلو فن کے لحاظ سے تھا۔ اس میں زبان، محاورہ، بیان، الفاظ کا انتخاب اور نشست، بحر یا وزن کی خیال یا موضوع سے ہم آہنگی، نظم کی ہیئت، تشبیہ، استعارے کنائے وغیرہ جزئیات، یہ سب باتیں مدِ نظر رہیں۔)

نظموں پر نظر ڈالتے ہوئے ہمیں ذرا احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ کیونکہ اگرچہ سطحی طور پر کسی صاحب کو اُن میں زندگی کے تنوع کا عکس نہ دکھائی دے۔ لیکن حقیقتاً وہ زندگی اور اُس کے

اکثر پہلوؤں سے ہم آہنگ ہیں۔ پہلی نظر میں دھوکے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اپنے تنوعات کے باوصف زندگی مجموعی حیثیت سے ایک ذات ہے۔ اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو ان نظموں میں ذہنی جسمانی، سماجی، سیاسی، ہر قسم کی باتوں کا ذکر ہے اور اس میں بھی خلوت اور جلوت کے دونوں پہلو نمایاں کئے گئے ہیں۔ اگر مختار صدیقی محبت کے عشرت پرستانہ پہلو کو روح کے لحاظ سے پرانے ہندوستان کے ماحول کی ہم آہنگی میں پیش کرتا ہے تو جوش اسی جذبے کی شدت کو موجودہ ماحول کے کنایوں سے ایک عظیم روح کے احساس کی گہرائی کا ترجمان بناتا ہے۔ عظیم قریشی محبت کی پرانی لے میں ایک نئی آہنگ پیدا کرنا چاہتا ہے اور ایک عاشق کے پرانے دب کر رہنے والے عاجزانہ انداز نظر سے گریز کی کوشش کرتا ہے لیکن یہ گریز بھی صرف ذہنی معلوم ہوتی ہے۔ شریف کنجاہی اسی جذبے کے اظہار کے لئے ماحول سے متاثر ہو کر بلیک اوٹ، کے واقعے کو پس منظر بناتے ہوئے ایک سماجی پریم کہانی کہتا ہے۔ اختر شیرانی محبت کے سرسری اور ہلکے پھلکے پہلو کو نفسیاتی مطالعے کی گہرائیوں سے ایک قابلِ غور چیز بنا دیتا ہے۔

بعض شعرا میں محبت، جوانی اور عشرت پسندی نئی تانیں لگاتی ہے۔ عبدالحمید عدم کو ایک نیم شگفتہ کلی بھڑکا دیتی ہے۔ اور وہ اذیت پرستانہ خواہشات کے اثر سے سنگین ارادوں کا حامل بن جاتا ہے۔ سلام مچھلی شہری عشرت کے ساتھ غربت اور بے چارگی کے مسائل کو لا کر ایک ہنگامی واقعے کو گہرا رنگ دیتا ہے۔ میرا جی ایک ایسے فرد کی تشنگی کا اظہار کرتا ہے جو خود نفسی میں غرق ہو۔ وشوا متر عادل ماحول کی ترجمانی کرتے ہوئے، ایک عام ذہن اور محبت کے لحاظ سے بھوکے پیاسے نوجوان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو طنز کا آلہ کار بنا کر سماج کی پشت پر تازیانہ لگاتا ہے۔ اور رشاد عارفی سماج کے بعض پہلوؤں کو مختلف مناظر کی شکل دے کر ایک فطری ضرورت کی تکمیل کا اظہار کرتا ہے۔ سعید احمد اعجاز تشبیہہ کی ایک ذہنی قلابازی سے انفرادی لیکن غیر جانبدارانہ تاثر پیدا کرتا ہے۔ مہدی علی خاں اندھے

مذہب کی جہالت کو نہایت فن کارانہ طریق سے طنز کا نشتر چبھوتا ہے۔ یہ سب شاعر ایسے فن کار ہیں جو زندگی کی ایک انتہا کو لئے بیٹھے ہیں۔ اِن کے برعکس دوسری انتہا کے ترجمان فیض احمد، مطلبی فرید آبادی، اور مقبول حسین احمد پوری ہیں۔ فیض سیاسی بیداری کا براہ راست پیغام دیتا ہے۔ اس کا اندازِ نظر ایک للکار کی مانند ہے۔ مطلبی فرید آبادی سیاسی ماحول کو پس منظر بتاتے ہوئے جو باتیں کہتا ہے ان کی حیثیت ایک پکار کی ہے۔ احمد پوری بظاہر زندگی کے ایک منظر کا رسیلا گیت گاتا ہے۔ لیکن بباطن وہ گیت نئی زندگی کا محرک بن کر حیاتِ کُل پر حاوی ہونے کے امکانات رکھتا ہے۔ یوسف ظفر اور تخت سنگھ دونوں انفرادیت کے ترجمان ہیں۔ ایک نے ہر چیز کو فراموش کر دیا ہے۔ اُس کے لئے ایک عورت کے رقص کی کیفیت ہی اہم ہے۔ وہ رقص جسے وہ پہلے بھی دیکھ چکا ہے۔ نظم کے پہلے بند میں پھر ناچنے کو کہتا ہے۔ وہ عورت ناچنے لگتی ہے دوسرے بند کے اختتام پر اُس کا ناچ ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن شاعر کی پیاس نہیں بجھتی۔ تیسرے بند میں وہ پھر اسی رقص کی فرمائش لئے جا رہا ہے۔
تخت سنگھ بھی ہر بات کو بھولا ہوا ہے۔ اُس کی نگاہوں میں چاندنی رات کا منظر ہے۔ پہلا بند اس منظر کے بیان سے بھرپور ہے۔ اور دوسرا بند پڑھنے والے کو اُس منظر کے تاثر سے ایک غیر مرئی فضا میں لے جاتا ہے۔ یہ دوسرے گروہ والے شاعر ذرا ذرا سی بات کے گن گاتے ہوئے بھی زندگی ہی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اور اپنی فن کارانہ خوبیوں کے باعث اُس پر حاوی ہیں۔ تیسرے گروہ کی ذہانت زندگی اور موت کی مانند گہری ہے۔ احمد ندیم قاسمی حیات بعد الممات کی پہیلی میں اُلجھا ہوا ہے۔ ن۔ م۔ راشد زندگی کی اُس یکسانی اور بیزاری کو جسے وہ ایک دَور کی اصطلاحات میں بیان کر رہا ہے نمایاں کرتا ہے۔ مخمور جالندھری زندگی کے اُس جنسی پہلو کو موضوعِ شعری بنائے ہے جو دنیا کا قدیم ترین پیشہ ہے۔ اور جس کی ضرورت جس کا دوام متنازعہ فیہ ہوتے ہوئے بھی اب تک جاری ہے۔ اور شاید جاری ہی رہے

اختر الایمان نقش پا کے استعارے میں ماضی کی نوحہ خوانی کر رہا ہے لیکن حال اور مستقبل پر بھی حاوی ہے۔ کیونکہ حال اور مستقبل بھی ایک روز ماضی ہی بن جائیں گے۔ وہ زندگی جس کی گہرائیوں کے متنوع رنگ ان تمام شاعروں کو الجھائے ہوئے ہیں۔ قیوم نظر کو ایک جنگل دکھائی دیتی ہے۔ اور وہ ایک ٹھہرے ہوئے جلوس کی صورت میں اس کی ترجمانی کر رہا ہے۔ لیکن ٹھہراؤ کے باوجود اس جلوس کا تاثر رواں دواں ہے، حرکت کر رہا ہے۔

ان نظموں کی روشنی میں ہم اس بات پر بھی غور کر سکتے ہیں کہ ۱۹۴۱ء کے دوران میں اردو زبان کے زندگی کے ترجمان شاعر کن موضوعات کی طرف مائل رہے۔ اور اس لحاظ سے اگرچہ وہ ہمیں اس کے ہر پہلو کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن دو باتیں دو مسئلوں کے طور پر نمایاں ہو جاتی ہیں۔ ایک سیاسی اور دوسری تہذیبی تشنگی۔ کیا معلوم کہ ۱۹۴۲ء نوجوانوں کے ان مسائل کو کس حد تک حل کرے۔ لیکن تشنگی کی صورت میں ہمیں اس بات کے لئے تیار رہنا چاہئے کہ آئندہ سال یہ مسائل ایک وسعت اور شدت اختیار کر جائیں گے فی الحال ہمارے لئے جس قدر غور و فکر کا سامان ہے وہ ان نظموں میں ہے۔

ہاں، ایک بات رہ گئی، نظموں کی تعداد کا تعین اس محفل کے وقت کی نسبت سے کیا گیا تھا۔ ثانوی انتخاب یعنی پچاس نظمیں بعض پہلوؤں سے ۱۹۴۱ء کی نمائندگی شاید زیادہ آسانی سے کر لیتیں۔

"م"

# نظمیں

# ازلی مسرتوں کی ازلی منزل

مٹیالے مٹیالے بادل گھوم رہے ہیں میدانوں کے پھیلاؤ پر
دریا کی دیوانی موجیں ہمک ہمک کر ہنس دیتی ہیں اک ناؤ پر

سامنے اودے سے پربت کی ابر آلودہ چوٹی پر ہے ایک شوالا
جس کے عکس کی تابانی سے پھیل رہا ہے چاروں جانب ایک اُجالا

جھلمل کرتی اک مشعل سے محرابوں کے گہرے سائے رقصیدہ ہیں
ہر سو پریاں ناچ رہی ہیں جن کے عارض رخشاں، نظریں دزدیدہ ہیں

عنبر اور لوبان کی لہریں دوشیزہ کی زلفوں ایسے بل کھاتی ہیں
چاندی کے ناقوس کی تانیں دھندلے دھندلے نظاروں میں گھُل جاتی ہیں

ہاتھ بڑھائے سر نیوڑھائے، پتلے سایوں کا اک جھُرمٹ گھُوم رہا ہے
پوجا کی لذت میں کھو کر مندر کے تابندہ زینے چُوم رہا ہے

ایک بہت پتلی پگڈنڈی ساحل دریا سے مندر تک کانپ رہی ہے
ناؤ چلانے والی لڑکی چپو کو ماتھے سے لگائے ہانپ رہی ہے

دیوانی کو کون بتائے اس مندر کی دھن میں سب تھک ہار گئے ہیں
سائے بن کر گھوم رہے ہیں جو بے باک چلانے والے پار گئے ہیں

وہ جب ناؤ سے اترے گی ہٹیالے ہٹیالے بادل گھر آئیں گے
میدانوں پر کہساروں پر، دریا پر ناؤ پر سب پر چھائیں گے

اول تو پگڈنڈی کھو کر گر جائے گی کالے غاروں میں بے چاری
بچ نکلی تو ہو جائے گی اس کے نازک دل پر اک ہیبت سی طاری

ہوش میں آئی تو رگ رگ پر ایک نشہ سا بے ہوشی کا چھایا ہوگا
جسم کے بدلے اس مندر میں دھندلا دھندلا اک لچکیلا سایا ہوگا

احمد ندیم قاسمی

# انتباہ

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے

بول زباں اب تک تیری ہے

تیرا ستواں جسم ہے تیرا

بول کہ جاں اب تک تیری ہے

دیکھ کہ آہنگر کی دکاں میں

تند ہیں شعلے سرخ ہے آہن

کھلنے لگے قفلوں کے دہانے

پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن

بول یہ تھوڑا وقت بہت ہے

جسم و زباں کی موت سے پہلے،

بول کہ سچ زندہ ہے اب تک

بول جو کچھ کہنا ہے کہہ لے۔

فیض احمد

# رات کی بات

چوڑیاں بجتی ہیں چھاگل کی صدا آتی ہے

فرطِ بے تابی سے اُٹھ اُٹھ کے نظر بیٹھ گئی  
تھام کر آس ہر آہٹ پہ جگر بیٹھ گئی

میرا غم خانہ عبارت رہا تاریکی سے  
موجِ مہتاب کہاں خاک بسر بیٹھ گئی

شبنم آلود ہوا جاتا ہے شب کا داماں  
تارے چھپتے ہیں کہ اب گردِ سفر بیٹھ گئی

بھیگتی رات نہا کر مرے اشکِ خوں میں  
جانے کو اُٹھی ہی تھی اٹھ کے مگر بیٹھ گئی

اُس نے دیکھا کہ مری رانی لجاتی آئی  
آنکھیں ملتی ہوئی فتنوں کو جگاتی آئی

سر سے ڈھلکا ہوا آنچل شکن آلود لباس  
چڑھی آنکھوں میں لچکتی ہوئی نیندوں کی جھلک

سو گئی تھی ذرا خود سب کو سلاتے شاید  
نیند کچی تھی کہ دی وعدے نے دل پر دستک

چونک کر اٹھی تو دیکھا کہ ستارے بن کر  
اوجِ افلاک پہ ہے مانگ کی افشاں کی دمک

شیشۂ مہ سے چھلک کر مئے تند و بے درد  
اُس کے ماتھے سے چھلکتی ہے سونے کی ڈلک

چوڑیاں ہاتھوں میں تھامیں چلی ہولے ہولے  
کر دے غمازی ہوا کہیں چھاگل کی چھنک

سرخی ٹیکے کی جبیں پر ذرا پھیلی پھیلی   جس طرح جام سے کچھ تھوڑی سی مے جائے چھلک

"زلفیں یوں چہرے پہ بکھری ہوئی ناگیں تھیں دُل   جس طرح ایک کھلونے پہ ہٹیں دو بالک"

مرے غم خانے پہ پہنچی تو کچھ آیا جو خیال   چوڑیاں چھوڑ دیں، چھاگل بھی نہ پہنی چھناچھنک

شکر ہے آئی تو ہے نیند کی گو ماتی ہے!

چوڑیاں بجتی ہیں چھاگل کی صدا آتی ہے"

مختار صدیقی

# نفسیات

ہاں تیری طرح
تیری ہی طرح
الفت بھی تو ہے مغرور!
چھین لئے گر تُو نے اس سے،
اس کی روح کے شیریں نغمے،
توڑ دیئے گر تُو نے اس کے،
خوابوں کے رنگین کھلونے،
دیوانہ پن سارا اپنا،
مستانہ پن سارا اپنا،
اپنے دل کے غم کی دولت!
اپنی جنت، اپنی نکہت!

اک دم تجھ سے لوٹا لے گی،
جانا بھی کچھ،
پھر کیا ہوگا؟
ایک مسلسل فرقت ہو گی
تجھ سے میری بستی دل کی
ایک خلا سی حائل ہو گی
سازِ الفت ہوگا چُور،
تیری طرح
تیری ہی طرح
الفت بھی تو ہے مغرور!

---

عظیم قریشی

# خودکُشی

کرچکا ہوں آج عزمِ آخری
شام تک ہر روز کر دیتا تھا میں
چاٹ کر دیوار کو نوکِ زباں سے ناتواں
صبح ہونے تک وہ ہو جاتی تھی دوبارہ بلند
رات کو جب گھر کا رُخ کرتا تھا میں
تیرگی کو دیکھتا تھا سرنگوں
مُنہ بسورے، رہگذاروں سے لپٹتے، سوگوار،
گھر پہنچتا تھا میں انسانوں سے اُکتایا ہوا،

میرا عزمِ آخری یہ ہے کہ میں
کود جاؤں ساتویں منزل سے بھی
آج میں نے پالیا ہے زندگی کو بے نقاب
آتا جاتا ہوں بڑی مدّت سے میں
ایک عشوہ ساز و ہرزہ کار محبوبہ کے پاس

اس کے تختِ خواب کے نیچے مگر
آج میں نے دیکھ پایا ہے لہو
تازہ و رخشاں لہو!
بوئے عطر میں بوئے خوں الجھی ہوئی
وہ ابھی تک خواب گاہ میں لوٹ کر آئی نہیں
اور میں کر بھی چکا ہوں اپنا عزمِ آخری
جی میں آتی ہے لگا دوں ایک بے باکانہ جست
اس دریچے میں سے جو
جھانکتا ہے ساتویں منزل سے کوئے و بام کو!
شام تک ہر روز کر دیتا تھا میں
چاٹ کر دیوار کو نوکِ زباں سے ناتواں
صبح ہونے تک یہ ہو جاتی تھی دوبارہ بلند
آج تو آخر ہم آغوشِ زمیں ہو جائے گی!

ن م راشد

# تو اگر واپس نہ آتی

(۱)

تو اگر واپس نہ آتی بحرِ ہیبت ناک سے
حشر کے دن تک دھواں اٹھتا بطونِ خاک سے

ہات آجاتا اگر تیرا نہ میرے ہات میں
دل پہ کیا کچھ بیت جاتی اس اندھیری رات میں

اُف وہ طوفاں، وہ بھیانک تیرگی، وہ ابر و باد
وہ ہوائے تند یاراں، وہ خروشِ برق و رعد

دفعتہً وہ روشنی کے سلسلے کا ٹوٹنا
وہ گھٹاؤں کی گرج سے نبضِ ساحل چھوٹنا

وہ اپالو کے کلیجے کو مچلتی "مان سون"
وہ سمندر کے تھپیڑے، وہ ہواؤں کا جنون

اور اس طوفان میں اے زندگی کی روشنی
کود پڑنا وہ سمندر میں ترا یک بارگی

(۲)

تو اگر واپس نہ آتی بحرِ ہیبت ناک [illegible]
حشر کے دن تک دھواں اٹھتا بطونِ خاک سے

اس دلِ سوزاں میں آتے اس بلا کے زلزلے
آسماں روتا زمیں ہلتی ستارے کانپتے

موت اور پھر موت تیری، الحفیظ والاماں
ہڈیوں سے آنچ اٹھتی اور بالوں سے دھواں

لیکن اک لمحے کے بعد اے پیکرِ حسن و حیات
جوش کو بھی کاوشِ ہستی سے مل جاتی نجات

پیدا ہوتا اُس تلاطم ایک طوفاں ایک جوش      بعدازاں تُو اور ہیں اور بحر و باراں کا خروش
اتصالِ روح ہوتا موت کے گرداب میں      آتشِ غم سرد ہو جاتی کنارِ آب میں

(۳)

بحر کے سینے کو جب طوفان میں لاتی ہوا      پی کے یہ پی کے آتی ہمارے گنگنانے کی صدا
جب گھٹائیں رقص کرتیں اور پپیہے کوکتے      نور میں لپٹے ہوئے دونوں ابھرتے بحر سے
رات جب کچھ بھیگ جاتی اور جھک جاتا قمر      سیر کرتے روز ہم باہیں گلوں میں ڈال کر
کونپلیں جب کوکنے لگتیں اندھیری رات میں      صبح تک دھومیں مچاتے ہم بھری برسات میں
چھیڑتا جب کوئی ساحل پر ہماری داستاں      پڑنے لگتیں سحر پہ ہلکی سی دو پرچھائیاں
زندہ رہتے حشر تک غم کے پرستاروں میں ہم      سانس لیتے سازِ حسن و عشق کے تاروں میں ہم

وقف ہو جاتے محبت کے فسانے کیلئے
سرد ہو کر آگ بن جاتے زمانے کیلئے

جوش

# بنی آدم

یہ بھیانک، سیہ، گھنا جنگل — جس کی صورت سے خوف طاری ہے
کون جانے کھڑا ہے یوں کب سے — وقت پر اس کی عمر بھاری ہے

موٹے موٹے تنے درختوں کے — جھرّیاں چھال پر درشت و مہیب
گرتی گرتی جھکی جھکی شاخیں — ابھری ابھری جڑیں عجیب عجیب

سمٹے سمٹے سے زرد زرد پتّے — سانحۂ موسم کے آتے جاتے ہوئے
پھیلے پھیلے سے ہر طرف سائے — گھاس پر تیرگی بچھاتے ہوئے

رات دن ماہ سال سال بہ سال — ان کی ہیبت میں ڈھلتے جاتے ہیں
اور یہ پرہول نقش صدیوں کے — اپنی عظمت سے جلتے جاتے ہیں

قیوم نظر

# چاندنی

یہ منڈل کا ساگر اُجالے کے کف میں  ستاروں کے اُبھرے ہوئے بُلبلے سے
کہ سہمی ہوئی رات کے سندر آنسو  ہیں چھٹکی ہوئی چاندنی ہیں نگلے سے
شعاعوں کے باریک آنچل کے اوجھل  جھپکتے ہیں آنکھیں دیئے چلبلے سے
اٹھائے کچھ اوپر کو چاند اپنی ٹھوڑی  اُس اونچی پہاڑی کے پیچھے کھڑا ہے
جھلکتے دھندلکے کی گہرائیوں میں  اک ایسی انوکھی ہنسی ہنس رہا ہے

کہ ہر جھومتے پیڑ کا پتا پتا
اُجالے کے دھاگوں میں لپٹا ہُوا ہے

وہ جُھکتی ہوئی ٹہنیاں اپنی جانب  اشاروں سے مجھ کو بلاتی ہیں شاید
وہ بیکنٹھ کی نازنیں اپسرائیں  زمیں کو تھپک کر سلاتی ہیں شاید
تھرکتی ہوئی پتیوں کو ہوائیں  محبت کا جُھولا جُھلاتی ہیں شاید
مجھے ایسے دھوکا سا ہوتا ہے جیسے  میں آکاش کی سمت اُڑا جا رہا ہوں
کبھی ہاتھ اٹھاتا ہوں تاروں کی جانب  کبھی مڑ کے پچھلی طرف دیکھتا ہوں

مرے ہر طرف ہے اُجالے کی برکھا
نہ جانے میں کس دیس میں آ گیا ہوں

تخت سنگھ

# برات

گاؤں کنارے باجا باجے    پریتم دیس بسانا ہو گا

آئے براتی آئے ساجن

آنکھوں میں بٹھلانا ہو گا

دے رہے تن من پریت کے گاہک

ہاتھ ان کے بک جانا ہو گا

گاؤں کنارے باجا باجے    پریتم دیس بسانا ہو گا

دھمک رہی ہے دور سے ڈھولک

سوئے بھاگ جگانا ہو گا

چمک رہی ہے مشعل کی لَو

اب تو لگن لگانا ہو گا

گاؤں کنارے باجا باجے    پریتم دیس بسانا ہو گا

گونج رہی شہنائی فرنا

من کی پیاس بجھانا ہو گا
دُھن ہنسی کی پریم کی دُھن ہے
اِسی میں گھُل مل جانا ہو گا

گاؤں کنارے باجا باجے پیتم دیس بسانا ہو گا

پھول کہیں بدھی کے ہنس کر
آنکھ سے آنکھ ملانا ہو گا

پریم کی بھینی بھینی خوشبو
ساجن گھر پھیلانا ہو گا

گاؤں کنارے باجا باجے پیتم دیس بسانا ہو گا

چھل بل دنیا کی ٹھوڑی
اس میں جی نہ کڑھانا ہو گا

ساجن کا پیغام یہی ہے
سُکھ کا ساتھ نبھانا ہو گا

گاؤں کنارے باجا باجے پیتم دیس بسانا ہو گا

مقبول حسین احمد پوری

# پسپائی

کیوں جگاتے ہو مرے سینے میں امیدوں کو؟
رہنے دو اتنا نہ احسان کرو
میں تو پردیسی ہوں اور آئی ہوں دو دن کے لئے
کل چلی جاؤں گی یا پرسوں چلی جاؤں گی
اور پھر آنے کا امکان نہیں
روز یوں گھر سے نکلنا بھی تو آسان نہیں
کیوں جگاتے ہو مرے سینے میں امیدوں کو

کیوں جلاتے ہو مرے دل کے چراغ
میں نے یہ سارے دیئے خود ہی بجھا ڈالے ہیں
آپ اس بستی کو تاریک بنا رکھا ہے
جس طرح جنگ کی راتوں کو بڑے شہروں میں
بتیاں خود ہی بجھا دیتے ہیں
زندگی کے سبھی آثار مٹا دیتے ہیں

اس طرح

میں نے یہ سارے دیے خود ہی بجھا ڈالے ہیں
آپ اس بستی کو تاریک بنا رکھا ہے

اس پہ ہر رات نئے حملے ہُوا کرتے تھے
آسمانوں سے کئی دشمنِ جاں طیارے
انہیں شمعوں کا نشانہ رکھ کر
بم گرا جاتے تھے اور آگ لگا جاتے تھے
اس کو تاریک ہی تم رہنے دو
دل کی دنیا میں اجالا نہ کرو
میری امیدوں کو مدہوش پڑا رہنے دو

تم نہیں مانو گے؟
تم دشمن سمجھتے ہی جاؤ گے؟
اچھا دیکھو!
لو جلاؤ میرے سینے کے چراغ
دل کی بستی میں چراغاں کر دو
پھر مرے جینے کا یا مرنے کا سامان کر دو

شریف کنجاہی

# ننّھا قاصد

ترا ننّھا سا قاصد جو ترے خط لے کے آتا تھا
نہ تھا معلوم اُسے کس طرز کے پیغام لاتا تھا

سمجھ سکتا نہ تھا وہ خط میں کیسے راز پنہاں ہیں
حروفِ سادہ میں کس حشر کے انداز پنہاں ہیں

اُسے کیا علم ان نیلے لفافوں میں چھپا کیا ہے
کسی مہوش کا ان کے بھیجنے سے مدعا کیا ہے

---

مگر مجھ کو خیال آتا تھا اکثر اُس زمانے میں
کہ اس کی حیرتِ طفلی ہے کیوں گم اِس فسانے میں

وہ باوجود کمسنی کیا یہ نہ دل میں سوچتا ہوگا
کہ باجی نے ہماری اپنے خط میں کیا لکھا ہوگا

اور آخر وہ اُسی کو نامہ لکھ کر بھیجتی کیوں ہے
کبھی بھیجا تو بھیجا لیکن اکثر بھیجتی کیوں ہے

---

وہ پہلے سے زیادہ بھائی کو کیوں پیار کرتی ہے
لفافہ دے کے لطفِ خاص کا اظہار کرتی ہے

پھر ایسے اجنبی پر اُس کی باجی مہرباں کیوں ہیں
اگر ہیں بھی تو گھر والوں سے یہ باتیں نہاں کیوں ہیں

اور اُس کے شبہ کی اس سے بھی تو تائید ہوتی ہے
چھپا کر خط کو لے جانے کی کیوں تاکید ہوتی ہے!

---

یہ نوخیز اجنبی جانے کہاں سے اکثر آتا ہے    جب آتا ہے تو باجی کی طرح خط لکھ کے لاتا ہے
عزیزوں کی طرح یہ کیوں مکاں میں آ نہیں سکتا    جب اُس سے پوچھتا ہے وہ اِسے سمجھا نہیں سکتا
کھلونے دے کے اس کو مسکرا دیتا ہے وہ اکثر    اور اک ہلکا سا تھپڑ بھی لگا دیتا ہے وہ اکثر

---

ترے قاصد کے یہ افکار دل کو گدگداتے تھے    اور اپنے بھولپن سے میرے جذبوں کو ہنساتے تھے
نہیں موقوف اُنہی ایّام پر جب بھی خیال آیا    تصوّر تیرے بعد اس کا بھی نقشہ سامنے لایا
مگر آج اِس طرح دیکھا ہے وہ نقشِ حسیں میں نے    کہ رکھ دی خاکِ حیرت پر محبت کی جبیں میں نے

---

وہی ننھا سا قاصد نوجواں ہو کر ملا مجھ کو    زمانے کے تغیّر نے پریشاں کر دیا مجھ کو
جنونِ ابتدائے عشق نے کروٹ سی لی دل میں    پس از مدت یہ لیلیٰ آ گئی پھر اپنے محمل میں
ترے قاصد سے ملتے وقت مجھ کو شرم آتی تھی    مگر اُس کی نگاہوں میں شرارت مُسکراتی تھی

---

شرارت کا یہ نظارہ مری حیرت کا ساماں تھا    کہ اس پردے کے اندر تیرا رازِ عشق عریاں تھا

اختر شیرانی

---

# ڈرائنگ رُوم

(سانیٹ)

یہ سیزری ہے، یہ تاج محل، یہ کرشن ہیں اور یہ رادھا ہیں
یہ کوچ ہے، یہ پائپ ہے مرا، یہ ناول ہے، یہ رسالہ ہے
یہ ریڈیو ہے، یہ قمقمے ہیں، یہ میز ہے، یہ گلدستہ ہے
یہ گاندھی ہیں، ٹیگور ہیں یہ، یہ شاہنشہ، یہ ملکہ ہیں

ہر چیز کی بابت پوچھتی ہے جانے کتنی معصوم ہے یہ!
ہاں اس پر رات کو سونے سے میٹھی میٹھی نیند آتی ہے
ہاں اس کے دبانے سے بجلی کی روشنی گُل ہو جاتی ہے
سمجھی کہ نہیں، یہ کمرہ ہے، ہاں میرا ڈرائنگ رُوم ہے یہ

اتنی جلدی مزدور عورت آخر یہ گلے میں باہیں کیوں؟
لے دیر ہوئی اب بھاگ بھی جا، بس اتنی محبت کافی ہے
اِس ملک کے بھوکے پیاسوں کو پیسے ہی کی حاجت کافی ہے
اتنی ہنس مکھ خاموشی، اتنی مانوس نگاہیں کیوں؟
میں سوچ رہا ہوں کچھ بیٹھا پائپ کے دھوئیں کے بادل ہیں
میں چھپ سا گیا ہوں اک نازک تخئیل کے میلے آنچل میں

---

سلام مچھلی شہری

# تیرے ہی بچّے تیرے ہی بالے

پچھم اُنڈے بادل کالے — پورب پھیلے دھوئیں کے گالے
پتھم ہوئے سب آنکھوں والے — کون بھلا اس کالی[1] کو ٹالے
کھانڈا باجے چمکیں بھالے — ناگ کھڑے جوں جیبھ[2] نکالے
توپیں کھول رہیں دھمّالے — تڑ تڑ تڑ تڑ گولی چالے
کٹ کٹ گرتے گورے کالے — بہنے لاگے خون کے نالے
سارے کسان ہیں سارے گوالے — سب مزدوری کرنے والے
آ[3] امبر[4] سے کون سنبھالے — تیرے ہی بچّے تیرے ہی بالے

دھرتی ماں چھاتی سے لگالے

رین اندھیری، پھر اندھیاری — ساگر کالے دھرتی کالی
جنگل جھلسے پھنک گئیں ڈالی — ہر ہر بالی کالی کالی
گرجیں توپ تو پھیلے لالی — یہ لالی خوں پینے والی
کشتی تیریں دھولی[5]، کالی — توپیں اور بن توپن والی

[1] موت [2] زبان [3] آن کر [4] عرش آسمان [5] سفید

ساگر ہل گیا تو پہ وہ چالی ڈوبی ناؤ نہ ڈوبن والی
ان ڈوبوں کو کون نکالے تیرے ہی بچے تیرے ہی بالے
دھرتی اس چھاتی سے لگالے
اُس بادل کے پیچھے ماتا دِیکھے گہری روکھوں کی لیلا
اس پر سندر انبر چھایا اس چھایا میں لال پھریرا
اس جھنڈے کے نیچے ماتا باجے ہے مزدوروں کا ڈنکا
نا کہیں کنگالی کا رونا نا کوئی بیری نا کوئی دُکھیا
نا کہیں ساہوکاروں کا ڈاکا نا راجا خوں پینے والا
پھولوں جیسا سب کا چہرا ہر اِک زندہ بوڑھا بچّا
یہ بھی ہیں ماتا تیرے ہی پالے تیرے ہی بچے تیرے ہی بالے
دھرتی ماں چھاتی سے لگالے

مرطابی فرید آبادی

# انوکھا بیوپاری

بچی ہوئی بھی ذرا حلق میں انڈیل تو لوں
چلوں گا ساتھ ترے دیکھنے تری فردوس

مگر یہ تیری گھنی اور بٹی ہوئی مونچھیں،
کھچے کھچے سے خد و خال سرخ سرخ آنکھیں،
بہی ہوئی تری ٹھوڑی پہ پان کی لالی،
تری کھنچی ہوئی لنگی کا سرنگوں طرہ،
یہ تیرے ٹخنوں سے اونچی لگی سڑی شلوار،
دبی ہوئی ترے ہونٹوں میں لمبے سگریٹ
اور اس سے اٹھتے دھوئیں کے بڑے بڑے حلقے،

ڈرا رہے ہیں مجھے روکتے بھی ہیں لیکن
چلوں گا ساتھ ترے دیکھنے تری فردوس
بچی ہی بھی ذرا حلق میں انڈیل تو لوں،

(۲)

الجھ گئی ہے مری سانس میرے سینے میں
یہ سیڑھیاں ہیں کہ گیسوئے دوست کے بل ہیں،
سجا ہوا سا یہ کمرہ ہے خواب گاہِ جمیل،
شکن سے پاک ہے رنگیں پلنگ کی چادر
پڑے ہیں کونے میں کیوں تیل، صابن اور حمام
میں سوچتا ہوں بیک وقت ایک ہی کمرہ،
نشاط گاہ بھی ہے اور غسل خانہ بھی،
مہک رہا ہے ہر اک گوشہ عنبریں ہے فضا
الجھ گئی ہے مری سانس میرے سینے میں

یہ سبز جھاڑیاں تھیں کہ گیسوئے دوست کے بل تھے؟
یہ کیا کہا اک اٹھنی تجھے ابھی دے دوں!
مطالبہ یہ ترا دل کو ناگوار نہیں
گراں نہیں تری جنت میں داخلے کا صلہ

میں ہو چلا تھا ترے انتظار سے بیزار
چلا گیا تھا کہاں چھوڑ کر مجھے تنہا!
ترے جلو میں یہ سب کون ہیں بتا تو سہی؟
مجھے کن انکھیوں سے اس طرح مسکرا کے نہ دیکھ
مری نگاہ میں جچتا نہیں ہے تیرا مال
یہ مانتا ہوں کہ عمر اس کی بیس سال کی ہے

مگر پسند نہیں مجھ کو خد و خال اس کے
یہ دوسری بھی نہیں — یہ بھی مجھے پسند نہیں
کمر ہے اس کی خم مے سے بھی عریض و طویل
یہ تیسری! نہیں اس سے وہ دو ہی اچھی تھیں
کھٹک رہی ہے نگاہوں میں ناک چپٹی سی
سن اے بہشت سیہ کار کے خدائے ذلیل!
میری طرف نہ یوں تیور چڑھا چڑھا کے دیکھ
مرے گناہ کے قابل نہیں تری حوریں
بنا کے دام بہت کم، نہ دے مجھے لالچ
میں تیرے اس کرم بے کراں سے باز آیا

---

مخمور جالندھری

# دسہرا اشنان

اے شاد آج صبح زمانے کے واسطے پُروا سنک رہی تھی سلانے کے واسطے
یہ نظم آئی مجھ کو جگانے کے واسطے

چادر نسیمِ منظرِ فطرت نے کھینچ لی آنکھوں سے نیند سیر کی عادت نے کھینچ لی
بستر چھپا سمٹ کے اٹھانے کے واسطے

بے اختیار اُٹھ کے چلا ہیں کدھر اُدھر دیوانہ وار اُٹھ کے چلا ہیں کدھر اُدھر
جاتی ہے وہ جدھر سے نہانے کے واسطے

اس پل نے جس پہ پل کے گذرتے ہیں راستے دریا عبور کر کے بکھرتے ہیں راستے
روکا ہے اُس کی راہ دکھانے کے واسطے

چلتا ہوا ہجوم ہے سیلاب کم خروش آنکھوں میں کیفِ عزم پرستش زباں خموش
جیون پوتر نا ہیں سجانے کے واسطے

حسنِ نظر نواز بھی جنسِ فضول بھی شمشادِ نونہال بھی بوڑھے ببول بھی
انجام کشتِ عمر بتانے کے واسطے

دس پانچ اُن میں "آنکھ مچولی کے رات دن"   چھ سات "چھپکے ہاتھ نہ آنے کے سال و سن"

دو چار منتظر چھوئے جانے کے واسطے

مندر کے روبرو بہ پرستانِ خوش خرام   ہے جس میں پیش پیش مری شوخیٔ کلام

کوشش میں اپنی جان جتانے کے واسطے

اب پاس آچکی ہے بہ تمثیلِ کہکشاں   اب مجھ کو بھانپتا ہے یہ انبوہِ مہوشاں

میری نظر سے لطف اٹھانے کے واسطے

سر ڈھک لئے گئے تو ہوئیں ساریاں درست   سینوں پہ سلوٹوں کو پریشاں لباسِ چست

ہر کوندنی پہ ہاتھ گھمانے کے واسطے

گھٹنوں کو جھول دے کے چھپائی ہیں پنڈلیاں   پھر بھی نظر نوازیٔ ساقِ غزل فشاں

مضمونِ بے پناہ سجھانے کے واسطے

جس کے لبوں پہ شرحِ تبسم وہ "مثنوی"   جس کی جبیں پہ قشقۂ ابہام ہے رُخی

کہتی ہے مجھ سے گھاٹ پہ آنے کے واسطے

وہ گھاٹ جس کا ریت ہمیں فرشِ انجمن   وہ پاٹ جس کے گیت محبت پہ نغمہ زن

وہ "چھاؤں" "میل جول چھپانے کے واسطے

۵۰

وہ ناؤ رہ گئی جو کنارے پہ ٹوٹ کے ریتی پہ دب چکی ہے جو پانی سے چھوٹ کے
کافی ہے ولولوں میں بہانے کے واسطے

. . . . . . . . . . .

جھربیریوں کی آڑ میں میلے کی حد سے دور پہنچا ہوں اس امید میں آئے گی وہ ضرور
کھو جائے گی کہیں مجھے پانے کے واسطے
پلٹے گی جب کہے گی سبھوں سے کہ تھک گئی میلے کی بھیڑ بھاڑ میں رستہ بھٹک گئی
چہرہ اداس بات بنانے کے واسطے
وہ طرزِ گفتگو کہ بہانہ نہ کھل سکے مژگاں پہ وہ نمی کہ بناوٹ نہ ڈھل سکے
شبہوں کو سو یقین دلانے کے واسطے

. . . . . . . . . .

جالے لگے ہوئے ہیں ابھی آستین پر رفتار سست سست نگاہیں زمین پر
پہنچی وہ یا نہیں یہ بتانے کے واسطے

شاد عارفی

# دھوبی کا گھاٹ

جس شخص کے ملبوس کی قسمت میں لکھی ہے
کرنوں کی تمازت
رشک آتا ہے مجھ کو
اُس پر

کیوں صبحِ شبِ عیش کا جھونکا
بن کر
رخسار کی بے نام اذیّت
سہلاتا ہے مجھ کو؟

کیوں خوابِ فسوں گر کی قبا چاک نہیں ہے؟

کیوں صرف اچھوتا،
انجان، انوکھا
اک خواب ہے خلوت؟
کیوں صرف تصوّر
بہلاتا ہے مجھ کو؟

کیوں گیسوئے پیچیدہ و رقصاں
نمناک نہیں ہے
اشکِ دلِ خوں سے؟
کیوں لمس کی حسرت کے جنوں سے
ملتی نہیں مجھ کو
بے قید رہائی؟

ملبوس پہ کرنوں کی تمازت
ہے دامِ نظر کا
اور صبحِ شبِ عیش کو گیسو کا مہکتا ہوا جھونکا
مرہونِ سحر کا
ہوتا ہی نہیں ہے

دیتا ہے تجھے جامِ جمشیدہ کی سی لذّت
کیوں سوچ رہا ہے
جو جھوٹا ہے یہ پیالہ؟
کیا آج زمانے میں کہیں دیکھی ہے تو نے
دوشیزہ مسرّت؟

---

کیوں دھوئے نہ پیراہنِ آلودہ کے دھبّے
مخمورِ مسرّت؟
کرنوں کی تمازت
بن جائے نہ کیوں رنگِ شبِ عیش کا اک عکسِ مسلسل؟

پھیلے ہوئے ملبوس پہ کرنوں کی تمازت
ہے زیست کے گیسو کی حرارت
اِس شخص کو پیراہنِ آلودہ کے دھونے ہی سے روزی
ملتی ہے جہاں میں
تو اُس پہ نظر کر۔

---

مجبورِ اذیت!
تو مان لے، اس عکس کا منظر

میراجی

یہ نیم خواب گھاس پر اُداس اُداس نقش پا — کچل رہا ہے شبنمی لباس کی حیات کو
وہ موتیوں کی بارشیں ہوا میں جذب ہو گئیں — جو خاکدانِ تیرہ پر برس رہی تھیں رات کو

یہ رہروانِ زندگی خبر نہیں کہاں گئے — وہ کونسا جہان ہے ازل نہیں ابد نہیں
دراز سے دراز تر ہیں حلقہ ہائے روز و شب — یہ کس مقام پر ہوں میں کہ بندشوں کی حد نہیں

ہے مرکزِ نگاہ پر چٹان سی کھڑی ہوئی — اُدھر چٹان سے پرے وسیع تر ہے زندگی
اسے پھلانگ بھی گیا تو اُس طرف خبر نہیں — عدم خراب تر ملے نہ موت ہو نہ زندگی

ہزار بار چاہتا ہوں بندشوں کو توڑ دوں — مگر یہ آہنی رسن یہ حلقہ ہائے بندگی
لپٹ گئے ہیں پاؤں سے لہو میں جذب ہو چکے — میں نقشِ پائے عمر ہوں فریب خوردۂ خوشی

کوئی نیا اُفق نہیں جہاں نظر نہ آ سکیں  یہ زرد زرد صورتیں یہ ہڈیوں کے جوڑ سے
فضا کے بازوؤں میں کاش اتنی تاب آ سکے  دکھا سکیں وہ عہدِ نو ہی زندگی کے موڑ سے

اختر الایمان

جنّت کی دیوار پہ چڑھ کر
میں اور شیطاں دیکھ رہے تھے،
جنّت کے پُر کیف نظارے
ہر سو، ہر جانب پھیلے تھے
اور اُن کی آغوش حسیں میں
دودھ کی جھیل کے پاس اک مُلّا
چورن کے اک پیڑ کے نیچے
حلوے کے اک ڈھیر پہ بیٹھا
سر کو جھکائے اونگھ رہا تھا۔

راجہ مہدی علی خاں۔

اے حسینہ! تیری موت؟

جس طرح کشمیر سے

کار پر آتے ہوئے

شاہرہ کے ساتھ ساتھ

گہرا گہرا سا نشیب

ہولناک اور دلفریب!

---

سعید احمد اعجاز

# رقص

چاندنی شب میں مرمر کی ناگن رقص کر
پھر اسی دھن میں، اسی گت پر چھناچھن رقص کر
چھن چھن چھناچھن رقص کر
مرمر کی ناگن رقص کر
طبلہ کہے دھن دھن دھمک
چھاگل کہے چھم چھا چھمک
پتلی کلائی لوچ کھائے
پاؤں کی ایڑی موچ کھائے
آنکھوں کے تارے ناچ جائیں
گت کے سہارے ناچ جائیں
ہاں رقص میں یوں انگلیاں
جیسے لچکتی کہکشاں
ترچھی نگاہیں رقص میں
چاندنی کی باہیں رقص میں

رُک اور رُک کر جھوم جا
دیکھ اِس طرف اور گھوم جا
گردن کو مٹکا کر دکھا
آنکھوں کو شرما کر دکھا
نازک کمر پر ہات رکھ
اب مان کہنا بات رکھ
چھن چھن چھناچھن رقص کر
مرمر کی ناگن رقص کر

(۲)

بال بکھرا کر ذرا باہیں اٹھا کر رقص کر
یوں نہیں، ترچھی نظر سے مسکرا کر رقص کر
ہاں ہاں مٹک کر رقص کر
گیسو جھٹک کر رقص کر
سینے کو بل دے، ناچ جا

پاس آ کے چل دے، ناچ جا
آنچل اُٹھا کر مسکرا
آنکھیں جھکا کر مسکرا
آئی وہ "چھن چھن" کی صدا
پاؤں کو تیزی سے اُٹھا
حلقے بناتی گھوم جا
سر کو ہلاتی گھوم جا
آڑے کبھی ترچھے کبھی
ایسے کبھی، ویسے کبھی
پہلو بدل کر یوں نکل
سانچے میں ڈھل کر یوں نکل
انگڑائیاں لیتی ہوئی
درسِ جنوں دیتی ہوئی
خاموشیوں پر وار کر
تابِ نظر بیدار کر
چھن چھن چھنا چھن رقص کر
مرمر کی ناگن رقص کر

ہاں رقص کر دیوانہ وار
سیماب گوں، پروانہ وار
بے تاب ہو کر گھوم جا
انگڑائی لے کر جھوم جا،
گردش میں آ اے جامِ جم!
رُک رُک کے چل، چل چل کے تھم
ایسے اُٹھا اپنے قدم
لہروں کا جیسے زیر و بم،
پھر اک طرف کو جھک کے چل
ہو جھیل میں جیسے کنول
کچھ لب ہلیں، انگلی اُٹھے
دل کی تمنا جی اُٹھے،
خاموش نغمے گائے جا
جلووں کے گُل برسائے جا
چکر لگا کے اک دم بیٹھ جا
چھم چھم چھما چھم بیٹھ جا،
چھن چھن چھنا چھن رقص کر
مرمر کی ناگن رقص کر

(۲۱)

پھر اسی سحر آفریں طرزِ ادا سے رقص کر
میں ہوں دیوانہ، مگر تیری بلا سے رقص کر

یوسف ظفر

(١)

فسردہ شام کی تنہائی پھیلتی ہی گئی
بکھر بکھر کے بڑھاتی ہوئی سکوں کے ہاتھ
چمکتے کانچ کا گلدان تھا — کنارے پر
سفید پھول کی گردن جھکی — جھکی ہی رہی
سکوت ریشمی پردوں کی نرم لہروں کو
تھپک تھپک کے سلاتا رہا، سلاتا رہا
کھڑی ہوئی وہ دریچے کے پاس دیکھتی تھی
ردائے آبِ افق — تیرتی ابابیلیں
میں اُس کے پاس کھڑا اپنے دل میں سوچتا تھا
مرے قریب مگر پھر بھی کتنی دور ہے تو،

کمر کا خط مرے بازو کو اک بلاوا ہے
جوان گرم، تنومند ہاتھ بڑھ کے اگر
خمِ کمر سے جو چھونے لگا تو کیا ہوگا؟
کھنچے رہے مگر احساس کی ستار کے تار
اور اُن کی گود میں خاموش، درد کا مارا،
اداس گیت محبت کا تھرتھراتا رہا۔

(٢)

فسردہ شام کی تنہائی پھیلتی ہی گئی
بکھر بکھر کے بڑھاتی ہوئی سکوں کے ہاتھ
میں اُس کے پاس کھڑا تھا، مگر وہ تنہا تھی
پھر انتظار تھا کس کا، اگر وہ تنہا تھی!

اُفق پہ ابر کے ٹکڑے تھے سرد آب بنے
اُنھی پہ اُس کی نظر تیغ انجماد بنی
جھلک رہا تھا بھیانک مہیب تیرہ و تار
جہاں کے مذہب و رسم و رواج کا اک بھوت
جو بار بار لپکتا تھا، دانت پیستا تھا۔
وہ ڈر گئی، وہ تو عورت تھی، اس نے کچھ نہ کہا،
پرے، کھجور کے اوپر، خموش، گول سا چاند
اُبھر رہا تھا، اُبھرتا رہا، ابھرتا رہا۔

(۳)

مری تڑپتی ہوئی روح پھڑپھڑاتی ہے
نحیف، زیست سے عاری ہے، پر بھی ٹوٹے ہوئے
مگر یہ رینگتے لمحوں کی چیونٹیاں چپ چاپ
لپٹ لپٹ کے اُسے بار بار چومتی ہیں

(۴)

برہنہ جسم ہے اور اجنبی فضا، بستر
خزاں میں فرشِ گلستاں کا ایک آئینہ،
"ذرا نظر تو اٹھاؤ" — نگاہیں جلتی ہیں
"بکھیر بھی دو حسیں بال" — لو بکھرتے ہیں
"لپٹنے بھی دو مجھے" — میں لپٹتا جاتا ہوں،
کوئی بھی روک نہیں ہے کوئی بھی ٹوک نہیں
فسردہ رات کی تنہائی اب سمٹتی ہے،
سمٹ سمٹ کے سکڑتی ہوئی سکڑتی ہوئی
یہ مجھ سے کہتی ہوئی — کل یہاں نہ آئیں گے



وشوامتر عادل Vishvamitra Adil

محمد عبداللہ پرنٹر پبلشر نے عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں چھپوا کر [illegible] روڈ لاہور سے شائع کیا۔